اسلامی تحریک کے چھے نکات

وہ گراں قدر رفیق جو تحریکِ اسلامی کے ساتھ اوّل روز سے چلے تھے "فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ" [۱] کے بمصداق اپنا فریضہ باحسن وجوہ انجام دے گئے، ان کی صف میں سے اب چند حضرات "مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ" [۲] کے مقام پر باقی رہ گئے ہیں۔ اس چھوٹے سے حلقۂ یارانِ طریق میں معمولی سے درجے کا ایک فرد میں بھی ہوں۔

میرا سفرِ تحریک

ان معزز و مکرم ہم سفروں کے ساتھ مجھ جیسا ناچیز آدمی بھی یہ دولتِ افتخار رکھتا ہے (اور اس کی بھاری ذمے داریوں کا احساس) کہ میں نے پانچ افراد پر مشتمل تحریک دارالاسلام اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں ۷۵ موسّسینِ جماعتِ اسلامی کے ساتھ بیٹھ کر دین کے عقائد اور نصب العین کی روشنی میں اقامتِ دین یا غلبۂ اسلام کی جس تحریک کا آغاز کیا اس کی تقریباً اکتالیس سالہ سرگرمیاں میرے سامنے عمل میں آئیں۔ (مضمون ہذا ۱۹۸۲ء میں لکھا گیا) حالات کے مختلف پیچ وخم سے گزرتے ہوئے جو فیصلے ہوئے اور جس طرح کے اقدامات کیے گئے ان کا میں گواہ ہوں۔ بہت سے معاملات میں خود میں نے تحریک کی یا دلائل دیے، بے شمار قرار دادوں اور بیانوں کی ڈرافٹ میں نے تیار کیے۔ پمفلٹ لکھے، مضامین شائع کرائے، خط وکتابت کی۔ نوجوانوں نے جب اسلامی جمعیتِ طلبہ کے مختصر سے حلقے کا آغاز کیا تو مولانا مودودیؒ کے ساتھ

---

[۱] اُن میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ (سورۃ الاحزاب: ۲۳)

[۲] اور اُن میں سے بعض وہ ہیں جو (اپنی باری کا) انتظار کر رہے ہیں۔ (سورۃ الاحزاب: ۲۳)

اس کی نشست میں میں بھی موجود تھا۔ اور اس وقت جس مقصد اور نصب العین کے مقرر کرنے اور کام کے جس نقشے پر چلنے کا فیصلہ ہوا میں اس کا گواہ ہوں۔ قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے پر جماعت کے نقشۂ کار اور پالیسی میں جو ناگزیر تبدیلی آئی اس کی بحثوں کا بھی مجھے علم ہے۔ پہلے انتخابات جن میں پنچایتی سسٹم بنا کر جماعت نے حصہ لیا، اس سسٹم کی نقشہ بندی اور اس کے متعلقہ عہد نامے کی تیاری میں میرا خاص حصہ رہا۔ مولاناؒ کی پہلی نظر بندی (ملتان) کے دور میں ''نظر بندی کیوں؟'' والا پمفلٹ میں نے لکھا جس کے اثرات اُس دور کے اصحاب جانتے ہیں۔ میرے سامنے ایک گروہ کی علیحدگی جماعت سے ہوئی۔ پھر جتنے بھی انتخابات ہوتے رہے ان کے ہونے کے بعد یہ جائزہ لے کر احتساب کیا جاتا رہا کہ اس دوران میں اخلاقی حدود اور اصولی تقاضوں کو کہاں کہاں نظر انداز کیا گیا۔ کئی بار متحدہ محاذ بنے اور ٹوٹے، ہر بار کے تجربے سے فائدہ بھی ہوا اور بعد کی ناکامی کے زخم بھی کارکنوں کے دلوں میں رہ گئے۔ اشتراکیت پسند اور لادینیت پسند طبقوں کے ساتھ اتحاد کی اگر اِکّا دُکّا صورت تجربۂ عمل میں آئی بھی تو اس کا آخری نتیجہ یہی نکلا کہ ایسے عناصر کے ساتھ سیاسی ضرورتوں کے لیے محاذ بنائے جائیں۔ اور اگر کوئی محاذ بنے تو صرف ایسی صورت میں جبکہ غلبۂ اسلام کو ایک اصول کے طور پر مانا جائے۔ اس وقت تجربوں کا ماحصل یہ تھا کہ اسلامی مقصد کو الگ رکھ کر عام قسم کے محاذ بنانا مفید نہیں ہوسکتا۔ بحالیٔ جمہوریت کے لیے متعدد بار متجانس عناصر کے ساتھ بھی رابطہ ہوا، مگر بالعموم اُس صورت میں کہ اسلامی رجحانات اور پاکستان کی سالمیت واستحکام کو پسند کرنے والا عنصر غالب رہے۔

پچھلے دور کا ایک اصل الاصول

لیکن بہر حال پچھلا سارا دور اس کڑی پابندی کے ساتھ گزرا کہ ہمارے تمام فیصلوں اور اقدامات میں اسلام اور اس کے تقاضے بطور اصل الاصول کارفرما رہیں گے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ حالت تا حال باقی ہے، مگر پھر بھی حالات کے بھنور آج اس بُری طرح ہمارے رفقاء کے سفینوں کو گھما رہے ہیں کہ اپنے آپ کو ایک طرح کا انتباہ دینے کی ضرورت ہے۔

میرا مقصودِ کلام

یہ سطور میں نے اپنی شان میں قصیدے کے طور پر نہیں لکھی ہیں بلکہ اس ذمے داری کے

احساس سے لکھی ہیں کہ کاروانِ اقامتِ دین کے ہر راہ گیر کو اب تک کے لمبے دور کی روشنی میں توجہ رہے کہ اس کارِخ اقدام کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ میری گزارشات ہر کسی کے لیے مؤثر یا قابلِ توجہ ہوں، مگر یہ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل اور موجودہ نسل نہیں تو بعد کی کوئی نسل اور میرے ملک میں نہیں تو باہر کے کسی ملک میں کبھی نہ کبھی ان باتوں کو پڑھا جائے گا اور ان پر غور کیا جائے گا۔ میں صرف اپنے ضمیر کے تقاضے سے خدا کی خوشنودی کے لیے لکھ رہا ہوں۔ وہ راضی ہو تو اور کسی کی مجھے پروا نہیں اور وہ اگر ناپسند کرے تو میں ہزار بار اُس سے معافی کا خواست گار ہوں۔

یہ چند باتیں محض یاددہانی ہیں- خود میرے اپنے لیے بھی اور مخلص رفقائے مقصد کے لیے بھی اور عام مسلمانوں کے لیے بھی- یہ سب کچھ ہمارے لٹریچر میں موجود ہے، مگر بسا اوقات ہم خود اپنی ہی فکر اور اپنی ہی دعوت اور اپنے ہی مقاصد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی پرانی باتیں تازہ ہوتی رہیں، البتہ یہ ممکن ہے کہ اندازِ بیان میں کچھ تھوڑا سا نیا رنگ پایا جائے۔

حرفِ اوّل

دین و سیاست کی تفریق کی جو لمبی صدیاں ہم پر گزری ہیں، ان کی وجہ سے ایک عرصۂ دراز سے دین و سیاست کے دائرے الگ الگ ہو گئے۔ اہلِ دین نے کہا کہ سیاست دُنیاداری ہے اور اس کی ضرورتوں کے ساتھ اسلام کے ایمانی و اخلاقی تقاضے صحیح سلامت رہ ہی نہیں سکتے۔ اور اہلِ سیاست نے طے کر لیا کہ سیاست جس نت نئے ہیر پھیر اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ چل سکتی ہے۔ اس میں انفرادی دین داری کی کچھ باتیں تو کھپ سکتی ہیں مگر سچّے خدا پرستانہ اُصول و مقاصد کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا، یعنی دین پسند ہو تو سیاست حرام اور سیاست پسند ہو تو دین سے چھٹی۔ یہ دونوں چیزیں یک جا اور یک جان نہیں ہو سکتیں۔ بدقسمتی سے بعض ائمہ اور مجددین کی مساعی، تحریکوں اور قربانیوں کے باوجود ہماری یہ دُوئی صدیوں غالب رہی۔

پھر انگریزی دور مغرب کا لادین طرزِ سیاست ساتھ لایا اور اس سے اثر پزیر معاشروں میں ''یک بام و دو ہوا'' کا فتنہ اور بڑھ گیا۔ جس نے دین کو پسند کیا اس نے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کو سنبھالا اور دنیا کے خیر و شر سے قطع تعلق کر لیا اور جس کو سیاست کے کارزار میں حصہ لینا پسند آیا، اُس نے تخت یا تلوار سنبھالی، نعرے ایجاد کیے، عوام کو آج ایک مقصد سے بھڑکایا اور کل دوسرے

مقصد سے، آج ''الف'' سے دشمنی ہوئی اور ''ب'' سے دوستی تو کل ''ب'' سے ہم پیالگی و ہم نوالگی قائم ہوئی اور ''الف'' سے کُٹی ہوئی، محاذ کا رُخ کبھی مشرق کی طرف اور کبھی مغرب کی طرف۔ اہلِ سیاست کا مقصد حصولِ اقتدار یا تحفّظِ اقتدار یا خاتمۂ اقتدار اور تبدیلیٔ اقتدار پایا اور ان کا قانون اوّل و آخر ''قانونِ ضرورت'' بن گیا۔ اس طرح بے اُصولی اور مطلب برآری اور وقت وقت کی نئی بولیاں اُصول بن گئیں۔ نتیجہ یہ کہ دین داری کا مزاج خانقاہی بنا اور سیاست کا مزاج جنگی و تصادمی۔ جہاں اس طرح کی دین داری آئی وہاں سیاست کے دروازے بند، اور جہاں اُس انداز کی سیاست بازی آئی وہاں دین کے چشمے خشک!

یہ تھا ہماری تاریخ کا عظیم ترین فتنہ جو صدیوں ہمارے اعمال کی آبیاری سے پنپتا رہا اور نئے دور میں خوب برگ و بار لایا۔

اس فتنے کے خلاف برصغیر میں جس طرح پہلے کے اکابرِ ملت، جن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور سیّدین شہیدینؒ نے فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مؤثر کام کیا، وہاں حکیم اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ نے بڑی زبردست فکری مہم چلائی کہ ذہنوں کو اس تخیلِ باطل کے شجرۂ خبیثہ سے پاک کر دیا جائے۔ اور مولانا مودودیؒ نے تو عملاً صحیح و جامع تصورِ دین کے تحت کئی سال تک ایک تحریک عملاً چلا کر دکھا دیا کہ دین کے تمام حدود و قیود کو قائم رکھ کر سیاست کی اصلاح کی سعی کی جاسکتی ہے۔ انتخابات اور پارلیمانی ایوانوں میں حصہ لیا جاسکتا ہے، عوامی حرکات جاری کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ہر قسم کی سیاسی تگ و تاز کے ساتھ تمام اسلامی عقائد، عبادات، اخلاقیات اور پیمانہ ہائے خیر و شر کو بغیر کسی ردّ و بدل کے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ یہ نئی دعوت بجائے خود بڑی انقلابی دعوت تھی جس کو آگے بڑھانے کے لیے ایک طرف مذہبی طبقوں کی طرف سے پتھروں کی بوچھاڑ کو سہنا پڑا اور دوسری طرف آزاد سیاست کے علم بردار سیکولرسٹ مسلمانوں کی صفوں کی جانب سے تیر کھانے پڑے، مگر بحمداللہ کہ ہماری دعوتِ حق نے ذہنوں کو دلائل سے فتح کیا۔ یہاں تک کہ نوخیز نسلوں نے بھی اس کو دوسروں سے بڑھ چڑھ کر اپنے اندر جذب کیا۔

اب مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ ہم خود اپنے ہی وضع کردہ اور اعلان کردہ تصوّرِ وحدت دین و سیاست کے بارے میں جب کبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں تو ایک طرف اسلامی انقلاب کے کارکنوں کے ذہنوں میں خطرناک جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف وحدتِ دین و سیاست

کے تصوّر کی دعوت ہمارے مخاطب خواص وعوام کے لیے کمزور ہونے لگتی ہے۔

میری عاجزانہ درخواست ہے کہ دینی وسیاسی سرگرمیوں میں انتہائی احتیاط کے ساتھ توازن قائم کیا جائے بلکہ ان کو دو الگ الگ چیزیں بنا کر چلنے کے بجائے صرف دین میں اسی طرح سیاست کو شامل سمجھا جائے، جیسے دعوت وتعلیم اور اخلاق و جہاد شاملِ دین ہیں۔ سیاست کو الگ سے لاکر دین میں ٹانکنے کا مسئلہ نہیں ہے۔

حرف دوم

یہ امر ہر معاملے اور ہر مرحلے میں ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ دین کو ایجاد کرنے والے ہم نہیں ہیں، بلکہ اسلامی تحریک کے اُصول ومقاصد سے لے کر اس کے طریقہ ہائے اقدام تک خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے پابند ہیں۔ ہم اس گھوڑے کی طرح نہیں ہیں جس کی اگاڑی پچھاڑی کھلی ہو اور وہ جس کھیت میں چاہے گھسے اور اس کی فصل چرتا پھرے یا جس باغ میں چاہے جا کر لوٹنیاں لگائے اور گل وگیاہ کو روند ڈالے۔

جب بھی کوئی مرحلۂ اقدام آئے یا کسی کارروائی کے لیے غور وفکر کیا جائے تو پہلے یہ سوچ لیا جائے کہ طریقِ قرآن اور طریقِ سنت کیا ہے۔

زمانے کے حالات اور تقاضوں کے تغیر کے ساتھ اجتہاد کیا جاسکتا ہے مگر شرائطِ اجتہاد اور اصولِ اجتہاد کے ساتھ آپ امورِ منصوص یا سنتِ محکمہ کو کسی بھی قانونِ ضرورت کے تحت بدل نہیں سکتے۔ اور اگر نصوص کے جنگلوں کو پھاند جانا ہو تو پھر آخر اس تکلف کی سرے سے ضرورت ہی کیا ہے کہ ہم سیاسی بے راہ روی کے ساتھ یہ دعوے بھی کریں کہ ہم تو اقامتِ دین کا کام کرنے چلے ہیں، لہٰذا ''جو بھی رستے میں آئے گا کٹ جائے گا۔''

آپ کو یہ امر بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ پارلیمانی انتخابات کی مخصوص سیاست، ضروری نہیں کہ آپ کو اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے تک پہنچادے۔ اب جبکہ آپ اصلاً ''دعوت'' ہی کے مرحلے میں ہیں، آپ کو سیاسی جدوجہد کو بھی کسی قدر احوال کی اصلاح کے جذبے کے ساتھ اصولاً دعوت ہی کے لیے ایک ذریعۂ اثر اندازی بنا کر استعمال کرنا ہے۔ اگر ہماری سیاسی سرگرمیاں لوگوں کے سامنے ہمارا ایسا کردار پیش کریں اور ہمارے بیانات اور اعلانات اور اداروں کے قیام، نعروں اور سلوگنوں کی ایجاد اور بعض تبدیلیوں کے لیے اپیل کے

طریقوں اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ اتحاد و اختلاف کی ایسی تصویر پیش کریں کہ جس کی وجہ سے خود ہماری اصل ہی کا اعتبار اٹھ جائے تو اگر ہم نے اقتدار کا بڑا حصہ اور جمہوری ایوانوں میں بہت سی سیٹیں بھی حاصل کرلیں تو ایسی جیت میں فی الحقیقت ہماری ہار پوشیدہ ہے۔

حرفِ سوم

اسلامی تحریک میں جدید دور کی اصطلاح کے مطابق ریڈیکل ازم یا استعجال پسندانہ اندھا جوشِ رفتار نہیں پایا جاتا۔ ریڈیکل ازم یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑی جماعت میں سے ایک مختصر گروہ اس جذبے سے سر اٹھاتا ہے کہ وہ ان اصول وحدود اور تاریخی تسلسلِ کار کے بعض تقاضوں کو توڑ کر جلدی سے آگے بڑھ جائے گا اور آناً فاناً انقلاب لے آئے گا،[۱] بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ وہ مارکسی تصوّر کی اصطلاح میں تاریخ کو جست لگانے پر مجبور کردے گا یا نئے انداز سے کہیں تو وہ دس بیس برس بعد کے انقلاب کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا حال کے لمحے تک لے آئے گا۔[۲]

اس قسم کا ریڈیکل ازم لوگوں کو ایڈونچرسٹ یا کارنامہ گر (اور بہ اصطلاح عام مہم جوٗ) بنا دیتا ہے۔ وہ قسم قسم کے نئے اصول اور نئے تجربے ایجاد کرتے ہیں۔ اور ہر قسم کے اُصول اور تجربے کے بعد وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ اسلام سلامت ہے، آخر اسلام کو کیا خطرہ؟ وہ کوئی کانچ کا بنا ہوا تو نہیں ہے۔

اسی نظریے کے تحت فارورڈ بلاک بنتے ہیں اور جہاں فارورڈ بلاک بنتے ہیں وہاں عام

---

[۱] عالمِ اسلام کی دینی تحریکوں میں کہیں کہیں یہ رجحان انقلابِ ایران کے ظہور کے بعد اُبھرا ہے، حالانکہ انقلابِ ایران کا عمل بہت پیچھے سے شروع ہوکر یہاں تک پہنچا اور وہاں کے حالات کی کچھ خصوصیات بھی ہیں جن پر دوستوں کی نظر نہیں۔ محض جوشیلے پَن کے اضافے سے کوئی فرق اصل کام میں واقع نہ ہوگا۔ صرف ایران کی فکری سیادت کا سکہ زیادہ خوبی سے چل سکے گا۔

[۲] بھارت میں تقسیم سے قبل کی کانگریس کے ہوتے ہوئے پہلے پہل تھوڑا سا ریڈیکل رجحان جواہر لال نہرو میں تھا مگر مہاتما گاندھی کے نظریہ عدم تشدد نے اس نورس رجحان کو زیادہ اُبھرنے نہیں دیا۔ بعد میں جوں جوں نہرو صاحب پر ذمہ داریاں بڑھتی گئیں وہ کانگریس کی بنیادی پالیسی کے علم بردار بنتے گئے۔ اسی طرح ایک تجربہ سبھاش چندر بوس کا تھا، مگر جیسا وہ تجربہ تھا اور جو کچھ حشر اس کا ہوا سب کے سامنے ہے۔

دنیوی سیاسی جماعتوں میں اندر ہی اندر ایک رسہ کشی چلتی رہتی ہے، لیکن دینی سیاسی جماعتوں کے ذہنوں میں پہلے انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر بحران اور آخر کار شکست وریخت ہونے لگتی ہے۔

لہٰذا خدارا آپ اپنے آپ کو ریڈیکل ازم اور فارورڈ بلاک جیسے تصورات سے بچائے رکھیے۔ یہ راستہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ بالآخر تخریب وتشدد کی طرف جاتا ہے۔ اسلامی دعوت میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی جب وہ تخریب وتشدد کے راستے پر پڑ جائے۔ اسلامی انقلاب کے راستوں پر چلنے والوں کی سب سے بڑی قوت ''مظلومیت'' ہوتی ہے اور یہی مظلومیت چاروں طرف دل ودماغ کو فتح کرتی جاتی ہے۔

حرفِ چہارم

دینِ برحق کی تحریک چاہے کسی مرحلے میں ہو، خاص طور پر دعوت کے ابتدائی یا ارتقائی مراحل میں، اس کے لیے ایسا جوش کارآمد ہے جو ہوش کے تحت رہ سکے، ایسا اقدام مفید ہے جو تدبر وتفکّر سے اٹھایا جائے، ایسا انقلابی عمل نتیجہ خیز ہے جو صبر وحکمت کا پابند ہو۔ ہر کام جو کیا جائے، پہلے اس کے متعلق شرعاً یہ سوچ لیا جائے کہ یہ کیسا ہے اور سنتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسّلام اور سنت صحابہؓ (خصوصاً خلفائے راشدین) رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روشنی میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ پھر اس کام کا پورا نقشہ تیار کیا جائے، سوچنے میں ملحوظ رکھا جائے کہ حامی قوتیں کون سی ہیں، مخالف کون سی اور ان کے درمیان کس طرح اقدام کیا جاسکتا ہے کہ حمایت میں اضافہ ہو اور مخالفت میں کمی، یا مخالفت زیادہ ہو بھی تو وہ دوسروں کی حمایت کو اور بڑھا دے۔ غور کر لینا چاہیے کہ کسی جنگ کے لڑنے کی صورت میں فتح ہوئی تو کیا ملے گا اور شکست ہوئی تو نتائج کیا ہوں گے؟ آپ کے مصروفِ کش مکش ہونے سے دوسری کون سی طاقتیں ہیں جو اپنا میدان پیدا کرنے کا فائدہ اٹھائیں گی؟ کس وقت کے حالات کیسے ہوں گے؟ کس مرحلے میں کیا طریقے کارگر ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا کسی معرکے میں آپ کی قیادت آپ کے کارکنوں کو پابندِ حدود اور وابستۂ اخلاق رکھ سکے گی؟ آپ ظلم کو مٹانے کے لیے یا اسے کمزور کرنے کے لیے ظلم کا طریقہ تو اختیار نہ کریں گے، جھوٹ کے توڑ کے لیے جھوٹ سے تو کام نہ لیں گے، جبر وتشدد کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے خود تو جبر وتشدد کی حرکات نہ کرنے لگیں گے؟

یہ ساری چیزیں اگر وقت پر توازن سے نہ سوچی جاسکیں اور جوشِ اقدام اور جنونِ انقلابیت غالب آجائے تو آپ جو چاہیں کریں، آپ دینِ برحق کی اقامت کا حق اللہ کی نگاہ میں ادا نہیں کر سکتے۔

فیصلہ کن چیز تو آپ کا کردار ہے۔ کیا آپ کا کردار کسی مہم میں ایسا رہے گا کہ عوام متاثر ہو جائیں؟ پولیس اور جیل کا عملہ متاثر ہو جائے؟ بیوروکریسی کی صفوں میں آپ کے قدرداں پیدا ہو جائیں؟ اخبارات اور سیاسی لیڈر آپ کی دعوت کا لوہا ماننے لگیں کہ کیسی اعلیٰ دعوت اور مقدس نصب العین ہے جس نے اس درخشاں کردار کے ساتھ ظلم کے سامنے کھڑے ہونے والے انسان پیدا کیے ہیں؟

یہاں میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ۱۹۵۲ء کے قادیانی ایجی ٹیشن کے زمانے میں مولانا مودودیؒ جہاں ایک طرف قادیانیت کو دائرۂ اسلام سے باہر سمجھتے تھے اور حکومت سے یہ منوانا چاہتے تھے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، وہاں وہ اس بات کے بھی سخت خلاف تھے کہ ایک تو مسئلہ دستور کی اسلامی بنیادیں طے کرانے کی لبِ بام پہنچی ہوئی تحریک کو موخر کر دیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ لاقانونیت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ مولاناؒ پر اس زمانے میں سخت دباؤ تھا۔ بہت زیادہ بیرونِ جماعت سے اور کسی قدر خود جماعتی کارکنوں کی طرف سے بھی۔ لیکن مولاناؒ اپنے اصولی موقف پر چٹان کی طرح مضبوطی سے جمے رہے۔ مجھے اس مجلس شوریٰ کا حال یاد ہے جبکہ قادیانی ایجی ٹیشن کے متعلق جماعت کے رویّے کا فیصلہ کرنے کی بحثیں ہو رہی تھیں اور بیچ بیچ میں ہر دو چار منٹ کے بعد کبھی فیصل آباد سے اور کبھی ملتان سے اور کبھی راولپنڈی سے اور کبھی لاہور کے کسی علاقے سے جوش انگیز خبروں کے ٹیلی فون آرہے تھے۔ اور جب آپریٹر کی کوئی چٹ پڑھ کر سنائی جاتی تو ذہنوں میں افکار کا سارا تانا بانا بکھر جاتا، مگر مولانا مودودیؒ ٹھنڈے دل سے چٹ ایک طرف رکھ کر زیرِ غور مسودہ کو پھر پڑھنے میں لگ جاتے اور اس کے الفاظ اور جملوں پر گفتگو ہوتی۔ ایک جملہ پورا ہوتا تو پھر اک ٹیلی فونی پیغام آجاتا اور پھر وہی صورت۔ مگر کام پھر اسی تدبّر و تفکر کے ساتھ ہونے لگتا جیسے پہلے ہو رہا ہوتا، یہاں تک کہ تحریر مکمل ہوگئی اور سب ارکان اس پر مطمئن ہو گئے۔

جذباتیت سے اس طرح ماورا رہ کر اصول پسند تحریکوں کے لیڈر اور مشیر اور کارکن حکمت و تدبّر سے کام کرتے ہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ جسے یہ کام آئندہ کرنا ہو، تحریک خواہ کسی بھی مرحلے میں ہو، وہ اس طرح کے دل و دماغ لے کر آئے۔ جذباتی ہیجانات اور اندھے فیصلوں کے ساتھ دوسرے انقلاب چل سکتے ہیں، مگر اسلامی انقلاب کا کام نہیں ہوسکتا۔

حرفِ پنجم

اسلامی سیاست کی راہ پر کبھی کوئی منفی کام بھی کرنا پڑسکتا ہے۔ مثلاً راستے سے کسی روڑے یا کانٹے کو ہٹا دینا تاکہ آگے بخوبی چلا جاسکے۔

لیکن اُصولاً اسلامی سیاست منفی سیاست نہیں ہے۔

منفی سیاست کے یہ معنی ہیں کہ آپ کا سارا زور اس بات پر ہو کہ فلاں کے دورِ اقتدار کو ختم کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے کسی ''لا'' کے بعد ''اِلّا'' کیا ہوگا؟ برصغیر کی تاریخ میں آج تک ہر طرف سے طرح طرح کی جماعتیں منفی سیاست کی علم بردار بن کے کام کرتی ہیں۔ کسی حکمراں سے اذیت اٹھانے کے بعد وہ اس غرض کے لیے جمع ہوجاتی ہیں کہ اور جو کچھ ہو، اس شخص سے نجات ملے۔ حالانکہ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ یا تو ایک اصول کو ختم کر کے اپنا دوسرا اصول غالب کریں، یا کسی شخص کے ہٹائے جانے کے بعد اس سے بہتر شخص کو کرسی پر بٹھانے کا قابلِ اطمینان منصوبہ رکھتے ہوں۔ ورنہ خالص منفی سیاست وہی رنگ اختیار کرے گی جیسا اس مشہور مقولے میں تھا کہ انگریزوں کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے کتوں اور سوروں کے ساتھ بھی اتحاد کیا جاسکتا ہے۔

اس منفی سیاست کا ایک تجربہ ایوب خاں کا خاتمہ تھا۔ پھر قوم کو کیا ملا؟ یحییٰ خاں گیا تو ذوالفقار علی بھٹو کو چھوڑ گیا۔ بھٹو کے خلاف طوفان اٹھا اور ان کی کشتی الٹ گئی۔ پھر کیا ملا؟ ایک نیا مارشل لاء جس کی عمر مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ اس مارشل لاء کو ہٹا دیکھیے۔ اس کے بعد کیا ملے گا، یا تو ایک اور مارشل لاء یا ایسی جمہوریت جس کی لایعنیت کی مار کھا کر قوم پھر چیخ اٹھے گی۔ اس اندھے جوئے کے لیے ہم اتحاد قائم کرنے بھی چلیں تو اور نہیں تو کم سے کم نفاذِ اسلام کی شرط ساتھ ہو، کم سے کم مظلوم افغانوں کی ہمدردی وحمایت کی شرط ساتھ ہو، کم از کم انسانوں کو خدا کے عطا کردہ حقوق کی بحالی کی ضمانت ساتھ ہو، کم از کم منکرات وفواحش اور مخلوط معاشرے کے فروغ کے روک تھام کی یقین دہانی ساتھ ہو۔

کیا ایسے جوئے میں ایم آر ڈی سے اتحاد موزوں رہے گا؟ پیپلز پارٹی سے موزوں رہے گا؟ سوشلسٹوں اور سیکولرسٹوں سے موزوں رہے گا؟ تمام بھلی بری جماعتوں سے موزوں رہے گا؟

ہمارے کندھوں پر اُصولوں اور اعلانوں کا ایک پشتارہ لدا ہے۔ ہمارے تاریخی تسلسل کی روداد کا طومار ہماری بغلوں میں ہے۔ کتاب وسنت کی کسوٹیاں سامنے رکھی ہوئی ہیں۔ ان چیزوں کو چھوڑنے سے ہم موقع پرستوں (Opportunists) کی تعریف میں داخل ہو جائیں گے۔ ایک مرتبہ کا غلط اقدام ہماری پچھلی ساری تاریخ کو دریا بُرد کر دے گا اور ہمارے کردار کا برسوں پرانا کھرا سکہ کھوٹا ہو جائے گا۔

ہمیں یہ بھی زیرِ غور رکھنا ہے کہ ہزار ہا لوگ جو ہماری طرف محبت وعقیدت کی نظریں اٹھائے ہم سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں، کیا ان کے ذہن پراگندہ نہ ہو جائیں گے؟

کسی گٹھ جوڑ کے بجائے جس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ بے اصول اور آزادی پسند لیڈروں کا غلبہ قائم ہو جائے، ہمارے لیے ممکن اور صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ ہم تنہا اپنی بازی اپنے شرائط پر کھیلیں اور دوسروں کو پاؤں رکھ کر چڑھنے کے لیے اپنا کندھا پیش نہ کریں۔ لیکن اگر اتحاد حالات کے تحت مفید اور ضروری ہی سمجھا جائے تو پھر صرف محبانِ دین ووطن کے ساتھ اتحاد کیا جائے۔

یوں بھی سارے اتحاد دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اگر اتحاد ہوا تو صدر صاحب جن لوگوں کو اپنی پارٹی قرار دے رہے ہیں (اور ان میں کچھ اور قوتیں بھی شامل ہیں) آنا تو ان کو ہے۔ پھر کیوں نہ اپنا کھیل صرف اپنے بل بوتے پر کھیلا جائے، خواہ چار پانچ یا دس پندرہ سیٹوں ہی کے لیے ہو۔

جب تحریک کی پالیسی اس بارے میں طے پا جائے گی تو میں بھی ہر دوسرے ساتھی کی طرح اسے قبول کروں گا — بادلِ ناخواستہ یا خواستہ!

حرفِ ششم

اس دور میں ہر جگہ طلبہ کی نوجوان قوت کی اہمیت بڑھی ہے اور نوجوان قیادت کے غلغلے

بلند ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جن لوگوں نے ان سلوگنوں کو بطور ایک نئے نظریے کے قبول کیا ہو، میں انھیں غلط سمجھتا ہوں۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی قیادت کے لیے بالعموم چالیس برس پورے کرنے پر انبیاءؑ کو دعوت الی اللہ اور قیادتِ جماعت (اور بعد میں سربراہیٔ ریاست) کے لیے اٹھایا ہے تو پھر اسلامی اصولوں کے تحت اسلامی مقاصد کا کام کرنے کے لیے نوجوانوں کو خالدِ جاں باز ؓ تو بننا چاہیے مگر صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی جگہ نہیں لینی چاہیے۔ اوّل الذکر بزرگ نے خالد کو آگے بڑھایا وہ زور شور سے آگے بڑھے، مؤخر الذکر بزرگ نے ان کو یک لخت پیچھے ہٹا دیا، حضرت خالدؓ نے ادب سے اس حکم کے آگے سر جھکا کر اپنے آپ کو ایک عام سپاہی کی جگہ کھڑا کر لیا۔ نہ کوئی گلہ نہ کوئی شکایت، نہ احتجاج۔ پہلے بھی اللہ ہی کی رضا سامنے تھی، اب بھی اللہ ہی کی رضا سامنے تھی۔ پہلے بھی خلیفہ اوّل کو امت کے قائد کی حیثیت سے واجب الاحترام سمجھا، بعد میں بھی خلیفۂ دوم کے حکم کی اطاعت نہایت ادب سے کی۔ حضرت خالدؓ نے تاریخ اسلام میں وہ عظیم الشان مثال چھوڑی ہے کہ آج کے ہر صاحبِ صلاحیت نوجوان لیڈر کو اس سے سبق لینا چاہیے۔

نوجوانوں کا کام ہے کہ والدین کا ادب کریں، اساتذہ کا احترام کریں، اپنے ہم مرتبہ نوجوانوں سے اختلاف کرتے ہوئے رواداری سے کام لیں، کوئی بات منوانے کے لیے تشدد سے کام نہ لیں اور احیائے اسلام کے کام کے لیے جو بزرگ میدان میں موجود ہوں (اور جن کے خلوص پر انھیں اعتماد ہو) ان سے رہنمائی لیں اور مشورے حاصل کریں اور وہ اگر کسی امر میں روک دیں تو اسلام کے ایک اطاعت پسند سپاہی کی حیثیت سے رک جائیں۔

اگر عمر کے ابتدائی جوشیلے مرحلوں میں دل و دماغ کو اس طرح سے تربیت نہ دی گئی تو آگے چل کر پھر اپنے آپ پر بریک لگانا ممکن نہیں ہوگا۔ پھر نوجوان قوت ایک چمکے ہوئے منہ زور گھوڑے کا روپ اختیار کر سکتی ہے۔ اگر ہٹلر کے طرز کا زلزلہ افگن کام کرنا ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ مگر اسلام کے مطلوبات اور معیارات دوسرے ہیں۔

میں جب اس طرح کی باتیں نوجوانوں سے کہتا ہوں تو انھیں پسند نہیں آتیں، بلکہ انھیں خوشامدانہ لہجہ بہت مرغوب ہوتا ہے۔ لوگوں نے انھیں چاٹ ڈال دی ہے کہ ان کی منت سماجت ہوتی رہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اہم دینی اُمور اور بڑے بڑے معاملات و اقدامات سے

متعلق اخلاقی تقاضوں کو ان پر اچھی طرح واضح نہ کرنا مداہنت ہے۔ میں اُن سے بہت محبت بھی رکھتا ہوں، مگر دینی معاملات میں ان سے مداہنت نہیں برت سکتا۔ چاہے میرے سامنے کیسے کیسے شاندار لوگ ان کو رام کرنے کے لیے، بہلانے پھسلانے کی تکنیک کیوں نہ اختیار کریں اور ان کے غلط کاموں پر بحث ہو تو صفائی کے وکیل کا پارٹ ادا کریں۔

یہ نوخیز قوت مجھے اس لیے عزیز ہے کہ شاید کل یہ لوگ تحریکِ اسلامی کے علم بردار بن کے اٹھیں گے، لہٰذا اسلامی ذہن کے نوجوانوں کو ایمان و اصول اور اخلاق و شائستگی کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے اعتماد کے بزرگوں سے (جن کو بھی وہ پسند کریں) رہنمائی حاصل کریں اور تقاضا کریں کہ ہماری غلطیاں بھی ہمیں واضح طور پر بتائی جائیں تاکہ ہم ان سے پرہیز کریں اور ہمیں راہِ صداقت پر اقدام کے لیے صاف صاف لفظوں میں ہدایت بھی دیں تاکہ ہم ان کی پابندی کریں۔

اس معاملے میں جو شخص بھی نوجوان قوت میں کوئی غلط فکر بھر دے گا یا غلط جذبات و رجحانات ابھار دے گا، یا ترکِ جادۂ حق پر بھی ان کو تھپکی دے گا تو پھر وہ ان حرکات سے بپا ہونے والے ہر بگاڑ کا قیامت میں جواب دہ ہوگا جو ہمارے نوجوانوں کی زندگیوں اور ان کی کارکردگی میں نمودار ہو۔